کھول دو

امرتسر سے اسپیشل ٹرین دوپہر کے دو بجے چلی اور آٹھ گھنٹوں کے بعد مغل پورہ پہنچی — راستے میں کئی آدمی مارے گئے، متعدد زخمی ہوئے اور کچھ ادھر اُدھر بھٹک گئے۔

صبح دس بجے کیمپ کی ٹھنڈی زمین پر جب سراج الدین نے آنکھیں کھولیں اور اپنے چاروں طرف مردوں اور بچّوں کا متلاطم سمندر دیکھا تو اس کے سوچنے سمجھنے کی قوتیں اور بھی ضعیف ہوگئیں اور وہ دیر تک گدلے آسمان کو ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا —— یوں تو کیمپ میں ہر طرف شور بپا تھا لیکن بوڑھے سراج الدّین کے کان جیسے بند تھے۔ اسے کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ کوئی اسے دیکھتا تو یہی خیال کرتا کہ وہ کسی گہری فکر میں ہے —— مگر اس کے ہوش وحواس شل تھے۔ اس کا سارا وجود خلا میں معلق تھا۔

گدلے آسمان کی طرف بغیر کسی ارادے کے دیکھتے دیکھتے سراج الدّین کی نگاہیں سورج سے ٹکرائیں تو تیز روشنی اس کے وجود کے سارے ریشوں میں اتر گئی اور وہ جاگ اٹھا۔ اوپر تلے اس کے ذہن میں کئی تصویریں دوڑ گئیں: لوٹ، آگ..... بھاگم بھاگ..... اسٹیشن ..... گولیاں..... رات اور سکینہ.....

سراج الدّین اک دم کھڑا ہو گیا اور پھر اس نے پاگلوں کی طرح اپنے چاروں طرف پھیلے ہوئے انسانوں کے سمندر کو کھنگالنا شروع کیا۔

پورے تین گھنٹے وہ ''سکینہ..... سکینہ.....'' پکارتا کیمپ کی خاک چھانتا رہا مگر اسے اپنی جوان اکلوتی بیٹی کا کوئی پتہ نہ چلا —— چاروں طرف اک دھاندلی سی مچی ہوئی تھی۔ کوئی

اپنا بچہ ڈھونڈ رہا تھا، کوئی ماں، کوئی بیوی اور کوئی بیٹی۔

سراج الدّین تھک ہار کر ایک طرف بیٹھ گیا اور اپنے حافظے پر زور دے کر سوچنے لگا کہ سکینہ اس سے کب اور کہاں جدا ہوئی، لیکن سوچتے ہوئے اس کا دھیان سکینہ کی ماں کی لاش پر جم گیا جس کی ساری انتڑیاں باہر نکلی ہوئی تھیں ——— وہ اس سے آگے کچھ اور سوچ نہ سکا۔

سکینہ کی ماں مر چکی تھی۔ اس نے سراج الدّین کی آنکھوں کے سامنے دم توڑا تھا ——— لیکن سکینہ کہاں ہے جس کے متعلق اس کی ماں نے مرتے ہوئے کہا تھا: ''..... مجھے چھوڑو، فوراً سکینہ کو لے کر یہاں سے بھاگ جاؤ.....''

سکینہ اس کے ساتھ ہی تھی ——— اور وہ دونوں ننگے پاؤں بھاگ رہے تھے۔ سکینہ کا دوپٹہ گر پڑا تھا۔ دوپٹہ اٹھانے کے لیے اس نے رکنا چاہا تھا اور سکینہ نے چلّا کر کہا تھا: ''.....ابا جی، چھوڑیئے .....!'' لیکن اس نے دوپٹہ اٹھا لیا تھا ——— یہ دھیان آتے ہی اس نے اپنے کوٹ کی ابھری ہوئی جیب کی طرف دیکھا اور جیب میں ہاتھ ڈال کر دوپٹہ نکالا، سکینہ کا وہی دوپٹہ — لیکن سکینہ کہاں ہے؟

سراج الدّین نے اپنے تھکے ہوئے ذہن پر بہت زور ڈالا مگر وہ کسی نتیجے تک نہ پہنچ سکا: کیا وہ سکینہ کو اپنے ساتھ اسٹیشن تک لے آیا تھا؟ کیا وہ اس کے ساتھ گاڑی میں سوار ہوئی تھی؟ کیا راستے میں گاڑی کے رکنے پر اور بلوائیوں کے گاڑی میں گھس آنے پر وہ بیہوش ہو گیا تھا جو وہ سکینہ کو اٹھا کر لے گئے .....؟

سراج الدّین کے ذہن میں سوال ہی سوال تھے، جواب کوئی نہ تھا ——— سراج الدّین کو ہمدردی کی ضرورت تھی لیکن چاروں طرف جتنے بھی انسان پھیلے ہوئے تھے، سب کو ہمدردی کی ضرورت تھی ——— اس نے رونا چاہا مگر اس کی آنکھوں نے اس کی مدد نہ کی۔ آنسو نہ جانے کہاں غائب ہو گئے تھے۔

چھ روز کے بعد سراج الدّین کے ہوش و حواس کسی طرح درست ہوئے تو وہ ان لوگوں سے ملا جو اس کی مدد کرنے کو تیار تھے ——— وہ آٹھ نوجوان تھے۔ ان کے پاس لاری تھی، بندوقیں تھیں۔

اس نے ان کو لاکھ لاکھ دعائیں دیں اور سکینہ کا حلیہ بتایا: ''گورا رنگ ہے اس کا اور بہت ہی خوبصورت ہے وہ..... مجھ پر نہیں ہے، اپنی ماں پر ہے..... عمر سترہ برس کے قریب ہے..... آنکھیں بڑی بڑی، بال سیاہ، داہنے گال پر موٹا سا تل ..... میری اکلوتی لڑکی ہے..... ڈھونڈ لاؤ

اسے، خدا تمہارا بھلا کرے گا.....''

رضا کار نوجوان نے بڑے جذبے کے ساتھ بوڑھے سراج الدّین کو یقین دلایا کہ اگر اس کی بیٹی زندہ ہے تو چند ہی دنوں میں وہ اس کے پاس ہوگی۔

آٹھوں نوجوانوں نے کوشش کی۔ جان ہتھیلی پر رکھ کر وہ امرتسر گئے۔ کئی عورتوں، کئی مردوں اور کئی بچّوں کو نکال نکال کر انھوں نے محفوظ مقاموں پر پہنچایا ——— لیکن دس روز گزر جانے پر بھی انھیں سکینہ کہیں نہ ملی۔

ایک روز وہ پھر اسی خدمت کے لیے لاری پر امرتسر جا رہے تھے کہ چھہرٹے کے پاس سڑک پر انھیں ایک لڑکی دکھائی دی ——— لاری کی آواز سن کر وہ بدکی اور اس نے بھاگنا شروع کر دیا۔

رضا کاروں نے لاری روکی اور سب کے سب اس کے پیچھے بھاگے۔

ایک کھیت میں انھوں نے لڑکی کو پکڑ لیا ——— لڑکی خوبصورت تھی۔ داہنے گال پر موٹا سا تل تھا۔

ایک نوجوان نے لڑکی سے کہا: ''گھبراؤ نہیں.....! کیا تمہارا نام سکینہ ہے.....؟''

لڑکی کا رنگ اور زرد ہو گیا۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ جب تمام نوجوانوں نے اسے دم دلاسا دیا تو لڑکی کی وحشت دور ہوئی اور اس نے مان لیا کہ وہ سراج الدّین کی بیٹی سکینہ ہے۔

آٹھوں رضا کار نوجوانوں نے ہر طرح سکینہ کی دلجوئی کی: اسے کھانا کھلایا، دودھ پلایا، لاری میں بیٹھایا ——— ایک نے اپنا کوٹ اتار کر اسے دیا کیونکہ دوپٹہ نہ ہونے کے باعث وہ بہت الجھن محسوس کر رہی تھی۔ وہ بار بار بانہوں سے اپنے سینے کو ڈھانپنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔

کئی دن گزر گئے ——— سراج الدّین کو سکینہ کی کوئی خبر نہ ملی۔

وہ دن بھر مختلف کیمپوں اور دفتروں کے چکّر کاٹتا رہتا لیکن کہیں بھی اسے بیٹی کا پتہ نہ چلتا۔ رات کو وہ دیر تک ان رضا کار نوجوانوں کی کامیابی کے لیے دعائیں مانگتا رہتا، جنھوں نے اسے یقین دلایا تھا کہ اگر اس کی بیٹی زندہ ہے تو چند ہی دنوں میں وہ اس کے پاس ہوگی.....

ایک دن سراج الدّین نے کیمپ میں ان رضا کار نوجوانوں کو دیکھا ——— وہ لاری میں بیٹھے ہوئے تھے۔

وہ بھاگا بھاگا ان کے پاس گیا ——— لاری چلنے ہی والی تھی کہ اس نے پوچھا: ''بیٹا ..... میری سکینہ کا پتہ چلا.....؟''

سب نے ایک زبان ہو کر کہا: ''چل جائے گا، چل جائے گا.....'' اور لاری چل پڑی۔

اس نے ایک بار پھر ان نوجوانوں کی کامیابی کی دعاء مانگی ——— اور یوں اس کا جی کسی قدر ہلکا ہو گیا۔

اسی شام کیمپ میں جہاں سراج الدّین بیٹھا ہوا تھا، اس کے پاس ہی کچھ گڑبڑ ہوئی — چار آدمی کچھ اٹھا کر لا رہے تھے۔

اس نے دریافت کیا تو اسے معلوم ہوا کہ ایک لڑکی ریلوے لائن کے پاس بیہوش پڑی تھی، لوگ اسے اٹھا کر لا رہے ہیں۔

وہ ان کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔

ان لوگوں نے لڑکی کو ہسپتال کے سپرد کیا اور چلے گئے۔

وہ کچھ دیر تک ایسے ہی ہسپتال کے باہر گڑے ہوئے لکڑی کے کھمبے کے ساتھ لگ کر کھڑا رہا، پھر آہستہ آہستہ اندر چلا گیا۔

ایک کمرے میں کوئی بھی نہیں تھا، بس ایک اسٹریچر تھا جس پر ایک لاش پڑی تھی۔

وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا ہوا بڑھا۔

کمرے میں دفعتاً روشنی ہوئی۔

اس نے لاش کے زرد چہرے پر چمکتا ہوا تل دیکھا ——— اور چلایا: ''سکینہ.....!''

ڈاکٹر نے، جس نے کمرے میں روشنی کی تھی، اس سے پوچھا: ''کیا ہے؟''

اس کے حلق سے صرف اتنا نکل سکا: ''جی میں..... جی میں اس کا باپ ہوں.....''

ڈاکٹر نے اسٹریچر پر پڑی ہوئی لاش کی طرف دیکھا، پھر لاش کی نبض ٹٹولی اور اس سے کہا: ''کھڑکی کھول دو.....''

مردہ جسم میں جنبش ہوئی ———

بے جان ہاتھوں نے ازار بند کھولا ———

اور شلوار نیچے سرکا دی ———

بوڑھا سراج الدّین خوشی سے چلایا: ''زندہ ہے..... میری بیٹی زندہ.....''

ڈاکٹر سر سے پیر تک پسینے میں غرق ہو چکا تھا۔

☆☆